ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

تشبیہاتِ رومی

عارف رومی تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ ہر قسم کے اخلاقی اور روحانی مسائل کو سلجھانے کے لئے اگرچہ ایک حد تک حکیم معنوی ہونے کی وجہ سے منطقی استدلال بھی کرتے ہیں لیکن بات زیادہ دلنشین اور یقین آفرین اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی تشبیہ یا مثال کے ذریعے سے مطلب کو واضح کرتے ہیں۔ ان کی مثنوی حکمت و عرفان کا بحرِ ذخّار ہے۔ ان کے بیان میں استدلال اور ذاتی وجدان ہم آغوش ہیں۔ وہ صوفی ہیں متصوف نہیں اور شاعری کے لحاظ سے نہ ان کو فن کار شاعر کہہ سکتے ہیں اور نہ وہ متشاعر ہیں۔ شاعری کو اُنہوں نے بحیثیت فن نہیں برتا۔ اس لئے کلام میں جا بجا ناہمواری دکھائی دیتی ہے۔ جو بات طبیعت میں سے جس طرح اُبھرتی ہے اسی طرح سُپردِ قلم کر دیتے ہیں۔ لیکن فطرت نے ان کو یہ غیر معمولی ملکہ عطا کیا ہے کہ ہر باریک نکتے کی وضاحت کے لئے ان کو دلنشیں تشبیہ سوجھتی ہے۔ جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی۔ تمام دنیا اور تمام زبانوں کے ادب کا جائزہ لینے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انبیاء کے صحیفوں کو چھوڑ کر روحانیت اور معرفت کا کوئی دفتر مثنوی معنوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تمام انبیاء اور اولیاء کے وجدانات اس میں یکجا ہو گئے ہیں اور پڑھنے والے کو یہ اذعان ہوتا ہے کہ کہنے والا محض دوسروں کے تجربات اور تعلیمات کو پیش نہیں کر رہا بلکہ اپنے ذاتی وجدان سے از روئے تحقیق و تجربہ بات کر رہا ہے۔ چونکہ تمام انسانوں کی ذہنی سطح ایک جیسی نہیں ہوتی اس لئے اچھا معلّم ہر طبقے کے لئے مختلف طرزِ بیان اختیار کرتا ہے۔ کلّموا الناس علیٰ قدر عقولھم انبیاء و اولیاء کا طرزِ تعلیم ہے۔ لیکن مولانا کے بیان میں یہ خوبی ہے کہ وہ تشبیہ و تمثیل سے کام لے کر حکمت پسندوں کی حکمت اندازی میں بھی اضافہ کرتے ہیں اور عام انسانوں کے لئے بھی بات کو قابلِ قبول اور دلکش بنا دیتے ہیں۔

میں کیا ہوں، مقصدِ حیات کیا ہے، یہ زندگی کدھر سے آتی اور کدھر جاتی ہے، خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟ ان سوالات کا جواب اہلِ دین بھی ڈھونڈتے ہیں اور اہلِ دانش بھی۔ مولانا مثنوی کے شروع ہی میں بانسری بجانا شروع کرتے ہیں اور بانسری کی تشبیہ سے روحِ انسانیت کی ماہیت اور اس کے مقصود و میلان کو دلنشین اور دلسوز طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ مولانا کا بانسری کا مضمون ان کی تمام مثنوی اور تمام تصوّف کا لبِ لباب ہے۔ ان ابتدائی اشعار کو باقی مثنوی سے کچھ ویسا ہی تعلق ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم سے جس طرح تمام قرآن اور اسلام کا عطر سورۂ فاتحہ میں موجود ہے اسی طرح مولانا کے بانسری کے اشعار میں جو مثنوی کی تمہید ہیں ان کا تمام تصوّف اور فلسفہ ایک لڑی میں

پر دیا گیا ہے۔

موسیقی کی نسبت انسانوں کا عام تجربہ یہ ہے کہ وہ جس قدر درد انگیز اور سوز و گداز سے لبریز ہو اسی قدر وہ انسانی روح کو متاثر کرتی اور اس کو شیریں و خوش آیند محسوس ہوتی ہے۔ موسیقی کی نسبت حکماء و صوفیہ و ماہرین نفسیات نے طرح طرح کے نظریات قائم کئے ہیں۔ ان میں سے بعض اہلِ دل اور اہلِ نظر اس یقین پر پہنچے ہیں کہ ایک خاص قسم کی موسیقی کے ذریعہ سے انسانی روح اپنی ماہیت بلکہ ماہیتِ حیات و کائنات میں غوطہ زن ہوتی ہے۔ اس قسم کا عرفان نہ حواس سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل و استدلال سے محسوسات و معقولات فقط سطحِ حیات پر تیرتے رہتے ہیں یا یوں کہئے کہ وہ ہستی کے حجاب و نقاب ہیں۔ اگرچہ عارف کے لئے یہ پردے بھی ساز کے پردے بن جاتے ہیں:

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

سامعہ خود ایک حاسہ ہے اور ظاہری صورت میں عالمِ جسمانی و مادی سے متعلق ہے لیکن موسیقی انسان کو اسی جسمانی واسطہ سے روحانی عالم میں پہنچا دیتی ہے۔ مولانا روم خود اس پر حیرت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ رباب کو دیکھو اس کے تار بھی مادی ہیں، اس کی لکڑی بھی مادی ہے اور اس پر منڈھا پوست بھی مادی ہے۔ لیکن جہاں مضراب نے اس میں ارتعاش پیدا کیا فوراً روحِ انسانی کے ازلی دوست کی دل نواز آواز سنائی دینے لگی:

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست　　از کجا می آید ایں آوازِ دوست

سرِّ پنہانی است اندر زیر و بم　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

رباب کی نسبت مولانا کا شعر نہایت روح پرور معانی کا حامل ہے لیکن بانسری سے عارفِ رومی نے جو مضامین پیدا کئے ہیں وہ کسی اور ساز سے پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ بانسری کا تعلق روحانیت اور الوہیت سے ہندوؤں کے ہاں بھی مسلّم ہے چنانچہ کرشن ان کے تصوّر میں اکثر نے نواز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اور سازوں میں سے ایسے نغمے بھی نکلتے ہیں جن سے انسان کے جذباتِ اسفل مشتعل ہو سکتے ہیں۔ لیکن بانسری کی لَے میں یہ بات نہیں اس میں ہمیشہ سوز و گداز ہوتا ہے۔ اور ایسی حسرت ٹپکتی ہے جس کا نہ کچھ ماخذ معلوم ہوتا ہے اور نہ موضوع و مقصود۔ مولانا اس حسرت کی توجیہ کرتے ہیں۔ وہ توجیہ یہ ہے کہ تمام ارواح رُوح الارواح یعنی اللہ تعالیٰ کی ہستی مطلق سے سرزد ہوئی ہیں۔ اگر روح کو نے سے تشبیہ دی جائے تو عالمِ ارواح ایک عالمِ نیستان بن جاتا ہے۔ ارواح کا خدا سے فراق ایک سرِّ سرمدی ہے جس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں لیکن صوفیہ کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ روح کی نے سے جو نے نکلتی ہے وہ نالۂ فراق ہے۔ روحِ انسانی اپنے اصلی ماخذ کی طرف عود کرنا چاہتی ہے جب تک اس کو دوبارہ وصال حاصل نہ ہو جائے تب تک اس کی شکایت آمیز حکایت درد انگیز طریقے سے بیان ہوتی رہے گی:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — و ز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

راز حیات اسی نالۂ فراق کے اندر مضمر ہے۔ حقیقت کو منور کرنے والا نور چشم و گوش میں نہیں ہے جس طرح جان، جو تن میں مستور ہے محسوسات کا معروض نہیں بن سکتی یہی حال اس سرِّ ازلی کا ہے جس میں روحِ انسانی کسی لے سے غوطہ زن ہوتی ہے۔

محبت اور عشق کو عام طور پر آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں کہ بانسری میں بظاہر ہوا گردش کرتی ہے لیکن یہ ہوا نہیں بلکہ آتشِ عشق کے شعلے ہیں:

آتشِ عشق است کاندر نے فتاد

جس روح کے اندر اس آگ کی گرمی نہیں، اس کی ہستی سے تو نیستی ہی بہتر ہے:

آتش است ایں بانگ نائے و نیست باد — ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
مطرب آہنگ ترنم ہائے شوق انگیز کرد — و ز دمِ نے آتشِ صاحبدلاں را تیز کرد
یاد آں مطرب کہ مارا ہر چہ بود از یاد برد — ہائے اندر نے دمید و اندیشہ ہا را باد برد (جامی)

موسیقی کیفیت کے لحاظ سے جامع اضداد ہے، اس میں غم انگیزی بھی ہے اور غمگساری بھی۔ اس میں ذوقِ وصال فراق کے ملال سے ہم آغوش ہے، اس کا درد مسرت سے زیادہ دلکش محسوس ہوتا ہے۔ عالمِ مادی میں تو زہر و تریاق یکجا نہیں ہو سکتے۔ لیکن عالمِ روحی کی نفسیات نرالی ہے:

ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید — ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید

نَے کی تشبیہ میں اور بھی خوبیاں ہیں نَے کے دو منہ ہوتے ہیں۔ ایک منہ لبِ نے نواز میں ہوتا ہے اور دوسرے منہ سے نوا نکلتی ہے۔ روحِ انسانی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کا ایک منہ ازلی نَے نواز کے دہن میں ہے اور دوسرا منہ وہ ہے جس سے عالمِ ظاہر میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس ہستی کا وصال مقصود ہے فراق آفریں بھی وہ خود ہی تھی اس لئے نالۂ فراق کا ماخذ بھی وہ خود ہی ہے:

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں پنہانست در لب ہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما — ہائے و ہوئے در فگندہ در سما
لیک داند ہر کہ اورا منظر است — کایں فغاں ایں سرے ہم زاں سر است
دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست — ہائے و ہوئے روح از ہیہائے اوست

بالبِ دمسازِ خود گر جفتمے — ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

بانسری کی تشبیہ میں دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا سینہ چاک چاک ہوتا ہے جو بات محض دہن سے ادا نہ ہو سکی وہ سینے میں سوراخ کر کے پھوٹنے لگی۔ شرحِ درد میں سینہ شرحہ شرحہ ہوگیا؛

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

نالے بدن کو توڑ کے نکلے ہر رنگ سے — منہ بند کیا ہوا میں سراپا دہن ہوا (امیر مینائی)

روحانی موسیقی ہر مذہب میں جزوِ عبادت شمار ہوتی ہے۔ ایسی ہی موسیقی کو غذائے روح کہتے ہیں۔ لیکن دنیا میں اچھی سے اچھی چیز کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔ سماع کے جائز و ناجائز ہونے پر فقہا اور صوفیہ نے بہت بحثیں کی ہیں لیکن بہترین جواب وہی ہے جو عارف رومی نے دیا ہے۔

سماعِ راست جائز اور سماعِ ناراست ناجائز

سماعِ راست کے لئے دو شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ سننے والا جذباتِ عالیہ رکھتا ہو اور ان کی پرورش کیلئے روحانی غذا کا طالب ہو۔ اور دوسرے یہ کہ موسیقی اس انداز کی ہو جو سفلی اور حیوانی جذبات کو نہ اُبھارے۔ قرآن کریم کی خوش الحانی سے قرأت بھی موسیقی ہی ہے جس سے سننے والوں کے قلوب پر رقت طاری ہوتی ہے۔ مثنوی میں ایک قصہ ہے کہ ایک یہودی کی لڑکی مائل بہ اسلام تھی اور اس کے والدین کو اس کا کوئی چارہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر لحنِ سمع خراش سے اذان دینے والے مؤذن نے اس کا دل اسلام کی طرف سے پھیر دیا:

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست — طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست[1]

حرص

گر بریزی بحر را در کوزۂ — چند گنجد قسمتِ یک روزۂ

انسانی حرص کی کوئی انتہا نہیں۔ دولت کی حرص حریص کی موت تک برابر ترقی کرتی رہتی ہے۔ حرص ایک بیماری ہے اگر اس کا علاج قناعت سے نہ کیا جائے تو روز افزوں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر مرض کا یہی قانون ہے خواہ بیماری جسمانی ہو یا قلبی۔

فی قلوبھم مرضٌ فزادھم اللّٰہ مرضا۔ — ان کے دلوں میں بیماری ہے اور اللہ ان کی بیماری کو بڑھاتا ہے۔

حریص کی آنکھوں کو بقول سعدی یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور۔

---

[1] اسلام اور موسیقی کی مفصل بحث کے لئے مولانا شاہ محمد جعفر کی محققانہ کتاب بصیرت افروز ہے۔ (اشاعت۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور)

مولانا فرماتے ہیں کہ حریص کبھی اس واضح حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ تقاضائے شہوات کو ایک حد تک ہی پورا کر سکتے ہیں اس حد سے آگے قدم اُٹھانے سے ایفائے مقصد کی بجائے خود مقصود ہی فوت ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کھانے کی لذّتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن نظر نہیں بھرتی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

جب ضرورت سے زیادہ کھا جاتے ہیں تو یا قے کرنے لگتے ہیں یا اسہال وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ہاضمہ ایسا خراب ہوتا ہے کہ پھر بدذائقہ دوائیاں کھانی پڑتی ہیں۔ اچھی غذا کا لقمہ حلق سے نہیں اترتا اور طبیب ہدایت کرتا ہے کہ اگر تندرستی چاہتے ہو اور مرگِ ناگہانی سے گریز مقصود ہے تو اس گریز کے لئے پرہیز لازمی ہے۔ اب ایسا شخص تندرست لوگوں کو دیکھ کر ترستا ہے کہ عمدہ کھانے کھا رہے ہیں اور ہضم بھی کر رہے ہیں پھر کفِ افسوس ملتا ہے:

بداعتدالیوں سے سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

ہنری فورڈ جو دنیا کا سب سے دولت مند انسان تھا اپنے سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ مجھے اپنی ذات کی خاطر کبھی دولت کی حرص لاحق نہیں ہوئی۔ جو عام لوگ کھاتے ہیں وہی میری غذا ہے اگر دس عظیم الشان محلات بھی تعمیر کر لوں تو ایک کمرے سے زیادہ میں استعمال نہیں کر سکتا ایک بستر سے زیادہ میرے سونے کے لئے درکار نہیں۔ شریفانہ قسم کے چند جوڑے کپڑوں کے میرے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کے لئے حرصِ مال میں اضافہ میرے کس کام آسکتا ہے۔ مولانا نے اس حقیقت کو ایک دلنشیں تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ ایک کوزے کا ظرف محدود ہوتا ہے۔ اگر اس میں ایک سمندر کو بھی انڈیل دیا جائے تو بھی کوزے میں بقدرِ ظرف ہی بھرے گا۔ باقی تمام پانی چھلک چھلک کر اِدھر اُدھر پھیلے گا کوزے کو اس سے کیا حاصل۔ کوزے میں تو اتنا ہی بھرے گا جتنا کہ انسان کے لئے ایک دن کے استعمال کے لئے کافی ہو:

کوزۂ چشمِ حریصاں پُر نشد تا صدف قانع نشد پُر دُر نشد

سیپی کے اندر موتی کیسے بنتا ہے۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ ابرِ نیساں کا ایک قطرہ اس کے دہن میں جاتا ہے پھر سیپی کا مُنہ بند ہو جاتا ہے اور قطرہ رفتہ رفتہ موتی بن جاتا ہے۔ یونہی کسی نے تُک لگایا تھا لیکن صدیوں تک عام و خاص سب نے اس کو ایک مسلّم حقیقت سمجھ لیا۔ اب معلوم ہوا کہ سیپی کے اندر خارج سے ریت وغیرہ کا کوئی ذرّہ داخل ہو جاتا ہے اور سیپی کو اپنے اندر خلش اور خارش محسوس ہوتی ہے فطرت اس ذرّے پر لعاب کا ایک غلاف چڑھا دیتی ہے تاکہ خارش محسوس نہ ہو۔ یہی لعاب خشک ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ لیکن شاعری میں ابرِ نیساں کے قطرے سے موتی بننا اب تک جاری ہے۔ شاعری کو سائنس کی تحقیقات سے کیا واسطہ:

تاک را سیراب کُن اے ابرِ نیساں در بہار ۔۔۔ قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

مولانا فرماتے ہیں کہ صدف کے اندر موتی قناعت نے بنایا۔ اگر وہ حرص میں اپنا منہ ابرِ نیساں کے قطروں کو پینے کے لئے کھلا رکھتی تو کوئی قطرہ بھی پرورشِ پنہاں سے محروم رہنے کی وجہ سے موتی نہ بن سکتا۔

حرصِ مال کے متعلق مولانا نے ایک اور بلیغ تشبیہ استعمال کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کی کشتی کو چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے نیچے اتنا ہی پانی ہو جو اس کو خوبی سے تیرا سکے اس سے زیادہ مقدارِ آب کی کشتی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے نیچے اور سو پچاس گز گہرا پانی ہو یا پانچ میل گہرا سمندر ہو وہ سب فالتو پانی ہے کشتی کی روانی کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ضرورت سے زیادہ مال کی حرص جب انسان کے دل کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو وہ زندگی کی خرابی کا باعث ہوتی ہے بعینہٖ جیسے پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اس کو ڈبو دیتا ہے۔ زندگی کے فطری اور حقیقی مقاصد کے لئے بقدرِ ضرورت مال لازمی ہے۔ پیغمبروں کو بھی استحکامِ دین کے لئے کچھ مال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مال اہلِ دل کے لئے ذریعۂ خیر ہوتا ہے وہ خود مقصد نہیں بن جاتا۔ دل کے اندر مال کا کوئی مقام نہیں۔ مالِ صالح رحمت ہے اور مالِ غیر صالح یا وافر از ضرورت زحمت اور آفت ہے:

مال را گر بہر دیں باشی حمول ۔۔۔ نعم مالٌ صالحٌ گفتا رسولؐ

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است ۔۔۔ زیرِ کشتی بہرِ کشتی پشتی است

حرص کا واحد علاج صفاتِ عالیہ کا عشق ہے جن کا کمال ذاتِ الٰہی میں پایا جاتا ہے۔ اس قسم کا عشق تمام جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج ہے: تخلقوا باخلاق اللہ۔ جو غایتِ حیات ہے، اس کا راستہ اور ذریعہ عشقِ الٰہی ہے جو تمام ادنیٰ و اسفل اور آنی جانی تمناؤں کو سوخت کر دیتا ہے۔ حکمتِ جسمانی اور حکمتِ روحانی سب سرچشمہ یہی ہے:

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد ۔۔۔ او ز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشقِ خود سودائے ما ۔۔۔ اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما ۔۔۔ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

مقصودِ حیات بلند ترین مقامات کی طرف پرواز ہے جن کا منتہا خدا کی ذات ہے۔ منزلِ ما کبریاست۔ حرص سے اس پرواز میں کوتاہی پیدا ہوتی ہے۔ روح کے پر و بازو حرصِ مال اور حبِ جاہ کے بوجھ سے محروم پرواز ہو جاتے ہیں:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (اقبال)

مولانا فرماتے ہیں کہ کمندِ عشق روح کے پر و بال بن جاتی ہے اور انسان کو کھینچ کر اور اڑا کر کوئے دوست میں پہنچا دیتی ہے: پر و بالِ ما کمندِ عشق اوست ۔۔۔ مو کشانش می کشد تا کوئے دوست

آئینۂ دل

دل کے آئینے کی تشبیہ عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر تشبیہ ہو بھی نہیں سکتی۔ تمام کائنات انسان کے دل میں منعکس ہوتی ہے لیکن اس انعکاس کے لئے لازمی ہے کہ دل کا آئینہ صاف ہو۔ حرص و ہوس، دنیاداری کا تردد، حُبّ الشہوات اس آئینے کو زنگ آلود کر دیتے ہیں اور عرفانِ حقائق کے بغیر مقصودِ حیات حاصل نہیں ہو سکتا۔ سینہ بے کینہ اور دل شفاف آئینہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر حقیقت جوں کی توں اس میں منعکس ہو۔ عام انسانوں کے قلوب زنگ آلود ہونے کی وجہ سے حقیقت کے غمّاز نہیں ہوتے ؎

آئینہ ات دانی چرا غمّاز نیست — زانکہ زنگارا زرخت ممتاز نیست
آئینہ کز زنگ و آلائش جُداست — ہر شعاع نورِ خورشیدِ خداست
رو تو زنگار از رُخِ او پاک کن — بعد ازاں آں نور را اِدراک کُن

حکماءِ عقلی کے نزدیک حصولِ علم کا ذریعہ یا محسوسات ہیں یا معقولات۔ انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے یا استخراج و استقراء سے معلومات حاصل کرتا اور ان میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن روحانیین کا تجربہ یہ ہے کہ حقیقی علم خارج سے معلومات کے اجتماع سے نہیں بلکہ باطن سے بذریعہ تصفیہ قلب پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم یہی ہے:

صیقلی کن صیقلی کن صیقلی!

صیقلی ہی ہر قسم کی تیرہ ہیکلی کا علاج ہے۔ خارجی معلومات سے انسان علّت و معلول کی کڑیاں جوڑتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اضدادِ حیات تشکیک آفرین ہوتے ہیں۔ اسی لئے استدلالی حکمت تشکیک کے دائرے سے آگے قدم نہیں رکھ سکتی۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ خارجی معلومات کا انبار لگاتے رہنے کی بجائے اگر انسان جلائے قلب میں کوشش کرے تو علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک پہنچ جائے جہاں علم لاریب فیہ ہو جاتا ہے اس کے بعد تشکیک کے کانٹے دل میں نہیں کھٹکتے۔ اسی ضمن میں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے رومی اور چینی مصوروں کے کمالِ فن کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک محل میں آمنے سامنے دو دیواریں معین کیں اور دونوں دیواروں کے درمیان پردہ حائل کر دیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ چینی ایک دیوار پر مصوری کا کمال دکھائیں اور رومی دوسری دیوار پر۔ اور دو متقابل گروہ ایک دوسرے کی تصویریں تا بہ انجام کار نہ دیکھنے پائیں۔ جب دونو گروہ کام ختم کر چکیں گے تو درمیان سے پردہ ہٹا کر مبصرین ان کا مقابلہ کرینگے۔ چینی تو نقاشی میں جاں فشانی کرتے رہے اور طرح طرح کے مناظر بنائے، لیکن رومی فقط اپنی دیوار کو صیقل کرتے رہے یہاں تک کہ وہ آئینہ بن گئی۔ جب پردہ ہٹایا گیا تو چینیوں کے تمام نقش و نگار رومیوں کی دیوارِ آئینہ کردار میں منعکس ہو گئے۔ مولانا فرماتے

ہیں کہ یہی حال حصولِ علم حقیقت کا ہے۔ ایک گروہ موقلم کی کاوش اور رنگ آمیزی سے تصویریں بناتا رہتا ہے اور دوسرا قلب کو صیقل کر کے تمام حقائق کو اپنے اندر منعکس کر لیتا ہے:

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن

رفع زنگ سے وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جو حسنِ رنگ نے پیدا کی تھی۔ صیقلی سے دل نہ صرف مظاہرِ آفاق کا آئینہ بن جاتا ہے بلکہ اس میں حقائقِ باطن بھی منعکس ہوتے ہیں جو حکمتِ آفاق سے ماورا ہیں:

آں جمالاتے کہ دامِ اولیا ست عکسِ مہ رویانِ بستانِ خدا ست

عشق و عقل

وہ عشق جو مصدر و مقصودِ حیات ہے اور جو وجہ تکوین و ارتقائے کائنات ہے جو تمام ہستی کی رگ و پے میں جاری اور جماد و نبات و حیوان و انسان سب پر کسی نہ کسی رنگ میں طاری ہے۔ عقل جوئی و استدلالی جب اس کی شرح کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے گدھا کسی دلدل میں پھنس جائے۔ جس قدر زیادہ سعی خروج کرے گا اسی قدر اور دھنستا چلا جائے گا۔ اس کا تعلق وجدان سے ہے بیان سے نہیں:

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں چو بعشق آیم خجل باشم ازاں
گرچہ تفسیرِ زباں روشنگر است لیک عشقِ بے زباں روشن تر است
چوں قلم اندر نوشتن می شتافت چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت
چوں سخن در وصفِ ایں حالت رسید ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید

عقل در شرحش چو خر در گل بخفت
شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

آفتاب و سایہ

ہستیِ مطلق یعنی ذاتِ باری تعالےٰ اور مخلوقات و موجودات کی باہمی نسبت کچھ اس انداز کی ہے جو سورج اور اس کے سائے میں پائی جاتی ہے۔ اگر آفتاب نہ ہو تو سائے کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔ کائنات اسی طرح خدا کا پتہ دیتی ہے جس طرح سایہ آفتاب کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگرچہ سایہ بھی ایک طرح سے آفتاب کی دلیل ہے۔ لیکن اس سے کم تر ہے۔ جس طرح کہ خود آفتاب آفتاب کی دلیل ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف رُخ کرو۔ اس کے لئے کسی استدلال کی ضرورت نہیں:

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب　　گر دلیلت باید از وے رو متاب
از وے ار سایہ نشانے مید ہد　　شمس ہر دم نورِ جانے می دہد

دنیا میں جتنی نباتی وحیوانی زندگی ہے وہ سب سورج کی بدولت ہے۔ حیات آفریں آفتاب ہے نہ کہ سایۂ آفتاب۔ تمام موجودات اپنی زندگی کے لئے شمس ازلی کے محتاج ہیں۔ محض موجودات میں گھرا رہنا ایسا ہے جیسے کہ کوئی شخص ہمیشہ سائے میں بیٹھا رہے۔ سائے میں تو اسی طرح نیند آجاتی ہے جس طرح کہانی سنتے سنتے انسان سو جاتا ہے۔ مقصدِ حیات بیداری ہے نہ کہ خواب :

سایہ خواب آرد ترا ہمچو سمر　　چوں برآید شمس انشق القمر
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　ہمہ آفتاب بینم ہمہ آفتاب گویم

سورج کے سامنے سایہ ہی بے حقیقت نہیں ہوتا بلکہ قمر بھی جو اس سے اخذِ نور کرتا ہے، اگر سورج کے سامنے آجائے تو ماند پڑ جائے۔ لیکن آفتابِ حقیقت ہمارے نظام شمسی والا سورج نہیں۔ یہاں کا سورج تو بیچارہ ہر وقت مسافر مبتلائے گردش رہتا ہے اور اس سے دیروز و فردا پیدا ہوتے اور آتے جاتے رہتے ہیں۔ آفتابِ حقیقت الآن کما کان رہتا ہے۔ ظاہری سورج کی مثل تو متصور ہو سکتی ہے لیکن آفتاب ازلی کی کوئی مثل نہیں۔ لیس کمثلہ شیئ۔ افلاک میں جو بلند و عالی کرّہ نار (اثیر) ہے وہ خود آفتابِ حقیقت کا محتاج اور اس کی مشیت کا اسیر ہے۔ خدا کی نظیر نہ ذہن میں آسکتی ہے اور نہ خارج میں کہیں مل سکتی ہے :

خود غریبے در جہاں چوں شمس نیست　　شمسِ جاں باقیست کورا امس نیست
شمس در خارج اگرچہ ہست فرد　　مثل او ہم می تواں تصویر کرد
لیک آں شمسے کہ شد منتش اثیر　　بتودش در ذہن و در خارج نظیر
در تصوّر ذات اورا گنج کو
تا درآید در تصوّر مثل او

اعتدالِ آرزو

انسان کے دل میں جتنی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنے ماخذ میں انسانی جبلت کا نتیجہ ہیں۔ کوئی آرزو اپنی ماہیت کے لحاظ سے مطلقاً قابلِ رد نہیں۔ مگر حیاتِ انسانی میں خرابی اور انتشار اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر آرزو ھل من مزید، میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کھانا پینا ہو یا جنسی لذّت یا حب مال و جاہ سب کا یہی حال ہے۔ نفس کے تقاضوں پر اگر تحدید نہ لگائی جائے تو نفس امارہ ہو جاتا ہے۔ بجائے محکوم رہنے کے وہ انسان پر مطلق العنان حکمرانی

کرنے لگتا ہے :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انسان کا ظرف اور اس کی قوتیں محدود ہیں۔ ایک حد تک تو آرزو جائز ہے جس سے ایک انسان کو نفع پہنچتا ہے اور دوسروں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ لیکن نفس پر آرزوؤں کو لادتے چلے جاؤ تو نہ وہ پوری ہو سکتی ہیں اور نہ ان سے کچھ مسرت وسعادت حاصل ہوتی ہے :

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مولانا فرماتے ہیں کہ انسان کی جسمانی ہستی ایک پرِ کاہ کے برابر ہے لیکن آرزوؤں کا پہاڑ اپنے اوپر لاد لیتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قدرت الٰہی کو دیکھو کہ ہر جگہ تناسب اور اندازے سے عمل کرتی ہے۔ سورج کو زمین سے اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ کرۂ ارض میں ہر جاندار ہستی اس کی حرارت سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ اگر سورج زمین سے قریب تر ہو جائے تو سب کچھ سوخت ہو جائے۔ انسان کو اس فطرت سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ کوئی چیز آفتاب عالم تاب کی طرح حیات بخش بھی ہو تو بھی اس سے منفعت اسی حال میں حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان اندازہ وتناسب کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ہر اچھی چیز کی تمنا کرے لیکن اعتدال کے ساتھ :

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ — برنتا بد کوہ را یک برگ کاہ
آفتابے کز وے ایں عالم فروخت — اندکے گر پیش آید جملہ سوخت

حکمتِ رومی
مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب
قیمت تین روپے

ملفوظاتِ رومی
مترجمہ تبسم صاحب
قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ
ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور